3 ۔ شرک کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

4 ۔ خاتم النبیینؐ کی حیثیت سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خصوصیات بیان کریں۔

5 ۔ آسمانی کتابوں پر مفصل تبصرہ کریں۔

6 ۔ انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے اثرات بیان کریں۔

7 ۔ آخرت کے عقیدے پر قرآن مجید کی روشنی میں بحث کریں۔

8 ۔ ملائکہ سے کیا مراد ہے؟ نیز کراماً کاتبین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

9 ۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے:

نفخ صور، عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات،

مشہور ملائکہ کے نام اور کام۔

باب دوم

اسلامی تشخص

اسلامی تشخص سے مراد ایسے تمام عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق ہیں، جو ایک مسلمان کو دوسرے تمام انسانوں سے الگ اور ممتاز کرتے ہیں۔

ارکان اسلام

ارکان رکن کی جمع ہے جس کے معنی "ستون" ہیں۔ رکن ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر کسی عمارت کے قائم رہنے کا دارومدار ہو۔ یہاں ارکان اسلام سے مراد دین کے وہ بنیادی اصول و اعمال ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت قائم ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ"

(بخاری و مسلم)

ترجمہ:۔ اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے (آخری) رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

کلمۂ شہادت

ارکان دین میں سب سے اہم کلمۂ شہادت ہے جس کے الفاظ ہیں:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ترجمہ:- میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور اس کے (آخری) رسول ہیں۔

اللہ کو ایک ماننے کا عقیدہ اسلام میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے جس کے بغیر کوئی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز پر انسان کا یقین اتنا پختہ ہو جائے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انسانی زندگی میں عقیدے کی اہمیت اور اس کے اثرات کا تذکرہ توحید کے باب میں تفصیل سے ہو چکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید انسان کو قناعت اور بے نیازی کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو لالچ، حسد اور بزدلی سے نجات دلاتا ہے۔ اور انسان کے دل میں یہ پختہ باتیں پیدا کرتا ہے کہ صرف ایک اللہ ہی خالق و رازق ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ عزت و ذلت اور حکومت و دولت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے سوا نہ کوئی کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے، نہ نفع۔ وہ جس کو جو کچھ عطا کرتا ہے ایک مصلحت کے تحت اور آزمائش و امتحان کی غرض سے عطا کرتا ہے اور پھر وہ جسے جو کچھ دینا چاہتا ہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور جسے کسی چیز سے محروم کرنا چاہتا ہے کوئی دوسرا اسے دے نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ایک اللہ کو ماننے کا عقیدہ انسان کو اس کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ انسان کے تمام چھوٹے بڑے، ظاہر و پوشیدہ اعمال سے واقف ہے، اسے غلط کاری و گناہ گاری سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے معاشرے کا ایک مفید اور ذمہ دار شہری بناتا ہے۔

کلمۂ شہادت کا پہلا حصہ یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عقیدۂ توحید ہی کا اعلان و اعتراف ہے۔ کلمۂ شہادت کا دوسرا حصہ یعنی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس امر کا اعلان ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور سچے رسول ہیں اور آپ کا پیش کردہ دین ہی دینِ حق ہے۔ ان دونوں باتوں

کی گواہی دیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ گو بظاہر توحید و رسالت دو ہیں، لیکن دراصل دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر کوئی شخص رسولؐ کو مان سکتا ہے اور نہ رسولؐ کو تسلیم کیے بغیر اللہ تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے (چونکہ رسولؐ پر ایمان لانے کے مفہوم میں آپؐ کی بتائی ہوئی تعلیمات کو تسلیم کرنا شامل ہے) جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ دل کی تمام خواہشات شریعتِ اسلامی کے تابع ہو جائیں۔ جیسا کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:-

"لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ"

ترجمہ:- تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے دل کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔

انسانی عظمت کا ضامن عقیدہ

اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اپنے قول و عمل سے توحید و رسالت کی گواہی دی اور اپنے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات میں شریعتِ اسلامی کی کماحقہ پیروی کا اہتمام کیا تو وہ انسانی عظمت کی بلندیوں پر جا پہنچے۔ لیکن جب یہ گواہی دلی تصدیق اور عملی اطاعت سے محروم ہو کر رہ گئی تو ہماری عزت و عظمت خاک میں مل گئی۔

نماز

اسلام ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو چند اعتقادات ہی دے دینے پر اکتفاء نہیں کرتا، بلکہ ان کی پوری زندگی کو ان اعتقادات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے عبادات کا ایک نظام مقرر کرتا ہے۔ جو نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے اور سب سے اہم جزو نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے

ارشادات میں سے ایک ارشاد ہے :-

أَقِيمُوا الصَّلوٰةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (سورۃ الروم: 31)

ترجمہ :- قائم رکھو نماز اور مت ہو شرک کرنے والوں میں -

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت سی احادیث ، نماز کی تاکید پر مشتمل ہیں جن میں سے ایک یہ ہے :-

رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ وَعَمُودُهُ الصَّلوٰةُ ،

ترجمہ : دین کی اصل بنیاد خدا اور رسول کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے اور اس عمارت کا ستون نماز ہے -

نماز کے لیے قرآن میں صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی دعا ہیں - مگر اصطلاحی معنوں میں نماز اس خاص طریقے سے عبادت کرنے کا نام ہے ، جو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھایا اور اس کے متعلق ارشاد فرمایا :-

اَلصَّلوٰةُ عِمَادُ الدِّيْنِ -

ترجمہ: یعنی نماز دین کا ستون ہے -

نماز کی تاکید

نماز چونکہ دینی تربیت کا اہم ترین حصہ ہے اس لیے ہر اُمت پر فرض رہی ہے اور تمام انبیاء اپنی اُمتوں کو نماز کی تلقین کرتے رہے ہیں - قرآن مجید میں نماز پڑھنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے - قرآن بتاتا ہے کہ نماز قائم کرنے والے فلاح پائیں گے اور اسے ترک کرنے والے ذلت و خواری کا شکار ہوں گے - ایک آیت میں مذکور ہے کہ جب عذاب کے فرشتے جہنمیوں سے عذاب پانے کی وجہ دریافت کریں گے تو وہ اپنے جہنم میں پھینکے جانے کی وجہ یہ بتائیں گے -

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (سورۃ المدثر: 43)

ترجمہ: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے -

دل و زبان سے اللہ کو معبود تسلیم کرنے کے بعد اس کے سب سے اہم حکم نماز کی ادائیگی سے انحراف ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے سے انکار کے برابر ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا -

مَنْ تَرَكَ الصَّلوٰةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (ترمذی)

ترجمہ : جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی ، اس نے کافرانہ روش اختیار کی -

نماز قربِ خداوندی کا سب سے مؤثر وسیلہ ہے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :-

إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى يُنَاجِي رَبَّهُ (بخاری)

ترجمہ :- جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو گویا اپنے رب سے چپکے چپکے بات چیت کرتا ہے -

اسی اہمیت کے پیش نظر قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا - نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :-

أَوَّلُ مَا سُئِلَ ، سُئِلَ عَنِ الصَّلوٰةِ

ترجمہ :- قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال کیا جائے گا -

نماز کے فوائد

1 - اللہ تعالیٰ کے سامنے بندہ کی دن میں پانچ بار حاضری اس کے دل میں یہ احساس تازہ رکھتی ہے کہ وہ صرف اور صرف اللہ کا بندہ ہے بندگی کا یہ احساس ، متواتر نماز پڑھنے سے ، ایک مسلمان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے - اور اس کی پوری زندگی تفصیلِ احکامِ الٰہی کا عملی نمونہ بن جاتی ہے -

2 - دن میں پانچ مرتبہ قربِ الٰہی کا احساس مسلمان کو یقین دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ ہے - وہ کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا - اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا احساس اسے گناہ کے کاموں سے روکتا اور اس کے دل سے ہر قسم کا خوف

اور غم دور کرتا ہے۔

3 ۔ نمازوں کے درمیانی وقفے میں بھی نمازوں کے اثرات جاری وساری رہتے ہیں نماز کے بعد گناہ کا خیال آئے تو بندہ سوچتا ہے کہ ابھی تو اپنے اللہ سے دعا کر کے آیا ہوں کہ گناہوں سے بچا، اور ابھی گناہ کا کام کروں گا، تو کچھ دیر بعد اس کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ یہ چیز مُستقلاً گناہ سے روکے رکھتی ہے۔

4 ۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سلسلے میں پانچ بار، باہم ملنے والے افراد کے درمیان محبت و یگانگت پیدا ہوتی ہے، جس سے سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔

5 ۔ نماز باجماعت اور بطورِ خاص جمعے اور عیدین کی نمازوں سے مسلمانوں میں اجتماعیت کا شعُور پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلمان رنگ، نسل، علاقے اور طبقے کے امتیازات سے بے نیاز ہو کر شانے سے شانہ ملا کر ایک امام کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں، تو اس سے ان کے درمیان فکری وحدت کے ساتھ ساتھ عملی مساوات کا اِحساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

6 ۔ اجتماعی شکل میں انجام پانے والے اَعمال کی کیفیات، اِنفرادی اُعمال کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ اِسی لیے اجتماعی نماز کا ثواب اِنفرادی نماز کے مقابلے میں ستائیس گنا ہوتا ہے۔

7 ۔ نمازیوں کو مسجد میں آتے جاتے دیکھ کر بے نمازوں کو ترغیب و تحریک ہوتی ہے اور وہ بھی نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

8 ۔ نماز میں امام کا اِتباع اور اس کی پیروی، اجتماعی نظم وضبط کا شعُور پیدا کرتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو نماز باجماعت کے لیے مسجد میں نہ پہنچنے والے افراد کے لیے فرمایا تھا کہ جو لوگ نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے۔ اگر مجھے ان کے بیوی بچّوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کے گھروں میں آگ لگوا دیتا۔

بے روح نمازیں

نماز کی ادائیگی کے مُتذکرہ بالا فوائد و ثمرات آج ہمیں کیوں حاصل نہیں ہوتے؟ غور فرمائیے ہم میں سے کتنے اَفراد ہیں جو نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اس کے الفاظ اور کلمات کے معنی و مفہوم سے آشنا ہیں۔ کتنے لوگ نماز میں حُضوریُ قلب سے بہرہ مند ہیں؟ اور نماز کے اہم ترین مقصد سے بخوبی آگاہ ہیں، کہ ان کی نماز انھیں بدی و بے حیائی سے روکتی ہو، جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ (سورۃ العنکبوت: 45)

ترجمہ:۔ بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بری بات سے۔

درحقیقت آج ہماری نمازیں بے مقصد ہیں۔ ایسے ہی جیسے کوئی پھول ہو، بغیر خوشبو کے! یا قالب ہو، بغیر روح کے۔

روزہ

روزہ بھی اسلام کا بنیادی رُکن ہے۔ اس کے لیے قرآن و حدیث میں "صَوم" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اپنے آپ کو روکنا ہے۔ اِصطلاحِ شریعت میں روزے سے مراد "صبحِ صادق سے لے کر غروب آفتاب تک اللہ کی خوشنودی کے لیے بعض مخصوص اُمور کی سرانجام دہی اور کھانے پینے سے اپنے آپ کو روکے رکھنا" ہے جو روزے کے علاوہ دوسرے ایام میں جائز ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق یہ پہلی امتوں پر بھی فرض رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ: 183)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو، فرض کیا گیا تم پر روزہ، جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر، تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

مذکورہ بالا آیت سے جہاں روزے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے، وہاں اس کو فرض کرنے کی حکمت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے تقویٰ کا حصول! جس سے مراد پرہیزگاری اور اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو برائیوں سے روکتی اور نیکیوں کی طرف راغب کرتی ہے۔

ضبطِ نفس

انسان کو نیکی کے راستے، اور بُرائی کے راستے پر ڈالنے والی اہم چیز خواہش نفس ہے۔ خواہشات اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع رہیں تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی خوبیوں کے فروغ کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن جب خواہشاتِ نفسانی ہدایتِ ربانی کے تابع نہیں رہتیں، تو انسان کو حیوانی سطح سے بھی گرا دیتی ہیں۔ روزے کا اصل مقصد انسان کی خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر کے اسے مُتقی بنانا ہے۔ جو شخص ہر سال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر پورا مہینہ اپنی بنیادی خواہشات پر قابو پانے کی مشق کامیابی سے مکمل کرے تو اسے ضبطِ نفس کی وہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ شیطان کی ہر ترغیب کا آسانی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

جب ایک انسان رمضان کے پُورے مہینے میں کھانے، پینے اور نفسانی خواہشات پر قابو رکھتا ہے۔ نیز دیگر اخلاقی برائیوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنا اکثر وقت عبادات اور نیک کاموں میں گزارتا ہے تو اس کی طبیعت میں نیکی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور اُسے بدی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ روزہ خواہشاتِ نفسانی پر قابو پانے کی تربیت کے ساتھ ساتھ انسان کی اَنانیت (خودپسندی) کا بھی مُؤثر علاج ہے۔ جب انسان روزے میں بھوک اور پیاس کی شدت کے باوجود، کھانے پینے کی اشیاء پاس ہوتے ہُوئے بھی، کچھ کھا پی نہیں سکتا، تو اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس جب دائمی کیفیت بن جائے، تو انسان میں ہر خلافِ شریعت عمل سے رک جانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے گئے روزوں سے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں" اور یہ بھی فرمایا کہ "بہت سے روزے دار ایسے ہیں کہ جن کو اپنے روزوں سے بھوک اور پیاس کی اذیت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا ہے کہ:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (بخاری)

ترجمہ: اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور غلط کاریوں سے نہیں بچتا تو اس کا کھانا پینا چھڑانے سے اللہ کو کوئی دلچسپی نہیں۔

روزوں کا ثواب

جو روزے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے مطابق ایمان اور اِحتساب کے ساتھ رکھے جائیں، ان کے ثواب کا اندازہ درج ذیل حدیثوں سے ہوگا۔

كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ ۔ (مسلم)

ترجمہ:۔ آدمی کے ہر عمل کا ثواب (اللہ تعالیٰ کے یہاں) دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہو جاتا ہے (لیکن روزے کی تو بات ہی کچھ اور ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر روزہ تو خاص میرے لیے ہے۔ اس لیے اس کا ثواب میں اپنی مرضی سے جتنا (چاہوں گا) دوں گا۔

مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْءٌ (سنن ابن ماجہ۔ ترمذی)

ترجمہ:۔ جو شخص اس (رمضان) میں کسی روزے دار کو اِفطار کرائے گا اس کے گناہوں کے لیے معافی ہے اور وہ خود کو نارِ جہنم سے بچالے

گا اور اسے روزے دار جتنا ہی ثواب ملے گا۔ جب کہ اس روزے دار کے اپنے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

روزے کے اجتماعی فوائد

یوں تو روزہ ایک انفرادی عبادت ہے لیکن اس کے درجِ ذیل اجتماعی فوائد بھی ہیں:

مہینہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر انسان کو دوسرے کی بھوک پیاس کا اِحساس ہوتا ہے اور دل میں ناداروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

کم سے کم غذا پر اکتفاء کی عادت، انسان میں قناعت و اِیثار کی صِفات پیدا کرتی ہے۔

ایک ہی وقت میں پوری مِلّتِ اسلامیہ کا ایک عبادت میں مصروف رہنا، باہمی یگانگت کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔ اس اِعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماہِ رمضان کو مُواسات اور غمگساری کا مہینہ قرار دیا ہے۔

ایک ماہ تک دن کے بڑے حصّے میں معدے کا خالی رہنا صحت جسمانی کے لیے مفید ہوتا ہے۔

رمضان المبارک اور قرآن حکیم

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط (سورۃ البقرہ: 185)

ترجمہ:- مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور روزے رکھے اس کے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اور رمضان کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ قرآن کے مضامین انسان کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہیں اور یہ ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی اوّلین شرط تقویٰ ہے جو انسان میں روزے کے ذریعے نشوونما پاتی ہے۔ اس لیے رمضان میں قرآن کی شب و روز تلاوت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کا بے انتہا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ اور نمازِ تراویح کی بھی یہی غرض اور مصلحت ہے۔

رمضان اور پاکستان

یوں تو رمضان المبارک پوری دُنیا کے مسلمانوں کے لیے رحمت اور مغفرت کا مہینہ ہے لیکن ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے اس مہینہ اور اس کی ایک مبارک شب کی خاص اہمیّت اس وجہ سے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک رات میں ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ رمضان کی ستائیسویں شب کو پاکستان کی تشکیل گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اس مملکت میں اسی کتابِ مقدّس کا نظامِ زندگی نافذ کیا جائے، جو اس مبارک شب میں نازل ہوئی اور ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا بھی اسی غرض سے تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ حیات نافذ کیا جائے۔ اس اعتبار سے رمضانِ المبارک، تشکیلِ پاکستان کی سالگرہ اور خدا سے کیے ہوئے ہمارے عہد کی تجدید کا بھی موقع ہے۔

بے اثر روزے

آج ہمارے روزوں کے وہ فیوض و برکات ظاہر نہیں ہوتے جن کا ہم اوپر کی سطور میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم روزے کے اصل مقصد تقویٰ (ضبطِ نفس) سے بے خبر ہیں، اس کی اہم شرائط، ایمان اور احتساب، دونوں سے غافل ہیں۔ جس طرح عام طور پر ہماری نمازیں دکھاوے کی ہیں، ویسے ہی ہمارے

روزے بھی بالعموم نمائشی ہو گئے ہیں۔

زکوٰۃ

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے، کہ قرآن میں اکثر مقامات پر ادائیگی نماز کے ساتھ ادائیگی زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ نظام زکوٰۃ کی حیثیت کے پیش نظر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار کرنے والوں سے جہاد کیا۔ باوجودیکہ وہ کلمہ گو تھے اور فرمایا کہ میں زندگی میں ان دونوں فرائض کی تعمیل میں کوئی فرق نہیں ہونے دوں گا۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاک کرنے کے ہیں۔ جو انسان زکوٰۃ ادا کرتا ہے، وہ اللہ کے حکم کے مطابق نہ صرف اپنے مال کو پاک کر لیتا ہے، بلکہ اس کے ذریعے اپنے دل کو بھی دولت کی ہوس سے پاک کرتا ہے اور دولت کے مقابلے میں اللہ کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اسی کے حکم پر اپنی دولت کو قربان کرتا ہے۔ ادائیگی زکوٰۃ اسے یہ بھی یاد دلاتی ہے، کہ جو دولت وہ کماتا ہے وہ حقیقت میں اس کی ملکیت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ یہ احساس اُسے معاشی بے راہ روی سے بچاتا اور اس کے تمام معاشی اعمال کو احکامِ الٰہی کا تابع کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق معاشی معاملات دین کا اہم حصہ ہیں۔ جب انسان دولت جیسی نعمت اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ایثار کی قدر کرتے ہوئے اس قربان شدہ مال کو اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ فرماتا ہے کہ بندے کا یہ قرض وہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔ ارشاد ربانی ہے:۔

إِن تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۙ
(سورہ التغابن : 17)

ترجمہ:۔ اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا وہ دونا کرے اُس کو تمہارے لیے اور تم کو بخشے اور اللہ قدردان ہے اور تحمل والا۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (سورہ التوبہ : 34)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی گاڑھ کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو عذاب دردناک کی خبر دیجیے۔

ان آیات کی رو سے زکوٰۃ کی ادائیگی انسان کے لیے آخرت کی نعمتوں کے حصول اور عذابِ جہنم سے نجات کا ذریعہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔

معاشی فوائد

1 - سودی نظام معیشت میں محنت کے مقابلے میں چونکہ سرمایہ کی افادیت کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے محنت کش اور کارکن طبقہ مسلسل غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور سرمایہ دار طبقہ مختلف طریقوں سے اس طبقے کی دولت ہتھیاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح معاشی نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ زکوٰۃ اس صورت حال کا بہترین حل ہے۔ نظامِ زکوٰۃ کے ذریعے دولت کا ایک دھارا امیر طبقے سے غریب طبقے کی جانب بھی مڑ جاتا ہے۔ جس سے غریب لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ (سورہ البقرہ : 276)

ترجمہ:۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔

ادائیگی زکوٰۃ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے پیدا ہونے والی

کمی کو پورا کرنے کے لیے صاحبِ مال اپنی دولت کسی نہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جس سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی شرح کیونکہ صرف اڑھائی فیصد ہے، لہذا صاحبِ مال یہ رقم دیگر قسم کے بھاری ٹیکسوں کے مقابلے میں خوش دلی اور دیانت داری سے ادا کرتا ہے اور اپنا سرمایہ پوری آزادی سے کاروبار میں لگاتا ہے، جب کہ بھاری ٹیکسوں کی ادائیگی کے خوف سے سرمایہ چھپانے کا رجحان بڑھتا ہے، جس سے ملکی معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔

معاشرتی فوائد

۱۔ معاشرے میں دولت کی وہی حیثیت ہے، جو انسانی جسم میں خون کی۔ اگر یہ سارا خون دل (یعنی مالدار طبقے) میں جمع ہو جائے تو پورے اعضاء جسم (یعنی عوام) کو مفلوج کر دینے کے ساتھ ساتھ خود دل کے لیے بھی مضر ثابت ہوگا۔ اگر ایک طرف مفلس طبقہ، ناداری کے مصائب سے دوچار ہوگا تو دوسری طرف صاحبِ ثروت طبقہ دولت کی فراوانی سے پیدا ہونے والے اخلاقی امراض (مثلاً عیاشی، آرام کوشی اور فکرِ آخرت سے غفلت شعاری) کا شکار ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ان دونوں طبقوں میں حسد اور حقارت کے علاوہ کوئی اور رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کشیدگی بڑھتی ہی جائے گی اور کسی نہ کسی بہانے ضرور رنگ لا کر رہے گی۔

ان تمام انفرادی و اجتماعی فوائد کے پیشِ نظر، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد یہ ہدایت کی گئی:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا

(سورہ التوبہ: 103)

ترجمہ:- ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کرو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر

میں بھی) پاک کرتے ہو اور باطن میں بھی) پاکیزہ بناتے ہو۔

زکوٰۃ کے مصارف

تقسیم زکوٰۃ کی مدات بھی اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما دی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورہ التوبہ: 60)

ترجمہ:- زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے رستہ میں اور راہ کے مسافر کو۔ ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس آیت کی رو سے مندرجہ ذیل مصارفِ زکوٰۃ معلوم ہوئے:

1۔ ان تنگ دست لوگوں کی اعانت جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
2۔ ان لوگوں کی اعانت جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہوں۔
3۔ زکوٰۃ کی وصولی پر متعین عملے کی تنخواہیں۔
4۔ ان لوگوں کی اعانت جو نو مسلم ہوں، تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو سکے۔
5۔ غلاموں اور ان لوگوں کو آزاد کرنے کے مصارف جو قید و بند میں ہوں۔
6۔ ایسے لوگوں کے قرضوں کی ادائیگی جو نادار ہوں۔
7۔ جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ دین میں جانے والوں کی اعانت میں۔
8۔ مسافر جو حالت سفر میں مالک نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو۔

جب اسلامی نظام حکومت قائم ہو تو زکوٰۃ حکومت کے سپرد کر دینا لازم ہوگا تاکہ وہ اپنے طور پر بہتر طریقے سے مقررہ مدات میں زکوٰۃ تقسیم کر سکے۔ البتہ اگر کسی خطۂ زمین

پر مسلمان غیر اسلامی حکومت کے زیر فرمان آجائیں، تو اس صورت میں ہر فرد اپنے طور پر ان مذکورہ مدات پر خرچ کر سکتا ہے۔

مسائل زکوٰۃ

زکوٰۃ ان لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس ایک خاص مقدار میں سونا، چاندی، روپیہ یا سامان تجارت ہو۔ اس خاص مقدار کو نصاب کہتے ہیں۔ مختلف اشیاء کا نصاب یہ ہے :-

1۔ سونا ـــــــ ساڑھے سات تولے

2۔ چاندی ـــــــ ساڑھے باون تولے

3۔ روپیہ، پیسہ اور سامان تجارت۔ سونے چاندی دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر۔

زکوٰۃ کسی مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اسے جمع کیے ہوئے پورا ایک سال گذر چکا ہو۔

ادائیگی زکوٰۃ کے چند اُصول

1۔ زکوٰۃ صرف مسلمانوں ہی سے لی جاتی ہے۔

2۔ وہ عزیز و اُقارب جن کی کفالت شرعاً فرض ہے۔ (مثلاً ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، شوہر، بیوی وغیرہ) انھیں زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ البتہ دور کے عزیز غیروں کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہیں۔

3۔ عام حالات میں ایک بستی کی زکوٰۃ خود اسی بستی میں تقسیم ہونی چاہیے۔ البتہ اس بستی میں مستحقین زکوٰۃ کے نہ ہونے، یا کسی دوسری بستی میں ہنگامی صورتحال مثلاً سیلاب، زلزلہ، قحط وغیرہ کے مواقع پر دوسری بستی میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

4۔ زکوٰۃ دینے والوں کو چاہیے کہ وہ ممکن حد تک یہ اطمینان کر لیں کہ زکوٰۃ لینے والا

اس کا مستحق ہے۔

5۔ زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی اشیاء خرید کر بھی مستحقین کو دی جا سکتی ہیں۔

6۔ مستحق زکوٰۃ کو بتانا ضروری نہیں کہ پیسہ یا مال زکوٰۃ کا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! ہمارے ملک میں نظامِ زکوٰۃ کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی کامیابی کے لیے ہر ممکن تعاون کریں۔ تاکہ اس کی برکت سے ہمارا معاشرہ دُنیا کے لیے مشعل راہ بن سکے۔

زکوٰۃ کے جملہ فوائد و ثمرات تب ہی ظاہر ہو سکتے ہیں، جب ہر صاحبِ مال اللہ جل شانہ کی خوشنودی کو اپنا لائحۂ عمل بنائے اور اسلام کے فیض رسانی اور نفع بخشی کے جذبہ کو ملحوظ خاطر رکھے بخصوصاً زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظامِ اجتماعی طور پر قائم و دائم ہو۔

حج

ارکانِ اسلام میں حج کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورہ آل عمران : 97)

ترجمہ :- اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر، حج کرنا اس گھر کا، جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی، اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

حج کی غرض و غایت چند خاص مقامات کی صرف زیارت ہی نہیں، بلکہ اس کی پشت پر ایثار، قربانی، محبت اور خلوص کی ایک درخشاں تاریخ موجود ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ جیسی عظیم ہستیوں کے خلوص و عزیمت کی بے مثال داستان ہے۔ اللہ نے 86 سال کی عمر میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ایک بیٹا دیا۔ اس کا نام اسماعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس اکلوتے بیٹے کو اس کی ماں کے ساتھ ایک غیر آباد اور ویران وادی میں چھوڑ آنے کا حکم دیا گیا جس پر خود انھوں نے بھی بڑے صبر و حوصلہ سے عمل کیا اور حضرت ہاجرہ نے بھی اس سلسلے میں بڑی عزیمت کا مظاہرہ کیا۔ جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور دوڑ دھوپ کے قابل ہو گیا تو اسے قربان کرنے کا حکم دیا گیا۔ اللہ کے اس عظیم بندے ابراہیم علیہ السلام نے اس پر بھی بڑی استقامت سے عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اس قربانی کو شرف قبولیت عطا فرمایا، وہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی بچا لیا۔ جنھوں نے تسلیم و رضا کی عظیم الشان مثال پیش فرمائی تھی۔ حج کے متعدد مناسک ہمیں انھیں عظیم اور بزرگ ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

حج ایک جامع عبادت ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ گناہوں کی بخشش ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :-

ترجمہ :- جو کوئی خالصتاً اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حج کرتا ہے اور دوران حج فسق و فجور سے باز رہتا ہے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو کر لوٹتا ہے گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

اپنے گناہ گار بندوں کو دُنیا ہی میں پاک صاف کر دینے کا یہ انتظام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی دلیل ہے۔ لہٰذا اس سے فائدہ نہ اُٹھانا حد درجہ کی ناشکری اور بدبختی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :-

ترجمہ :- جس (صاحبِ استطاعت) شخص کو نہ کوئی ظاہری ضرورت، حج سے روک رہی ہو، نہ کوئی ظالم بادشاہ اس کی راہ میں حائل ہو اور نہ کوئی روکنے والی بیماری اسے لاحق ہو اور پھر بھی وہ حج کیے بغیر مر جائے تو وہ خواہ کسی یہودی کی موت مرے یا نصرانی کی۔

جامعیت

حج جیسی جامع عبادت میں تمام عبادات کی روح شامل ہے۔ حج کے لیے روانگی سے واپسی تک دورانِ سفر نماز کے ذریعے قربِ الٰہی میسر آتا ہے۔ حج کے لیے مال خرچ کرنا زکوٰۃ سے مشابہت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات اور اخلاقی برائیوں سے پرہیز اپنے اندر روزے کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ گھر سے دوری اور سفر کی صعوبت میں جہاد کا رنگ ہے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "سب سے افضل جہاد حج مبرور

(مقبول) ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی ارشادِ گرامی کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ فرمایا کرتے۔ "حج کا سامان تیار رکھو کہ یہ بھی ایک جہاد ہے۔"

زائرینِ خانہ کعبہ کی کیفیات

اگر حج کے مناسک پر غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ہر مرحلہ اپنے اندر اخلاقی و روحانی تربیت کا سامان رکھتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اور دنیوی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر، دو ان سلی چادریں اوڑھ کر "لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" کی صدائیں بلند کرتے ہوئے بیت اللہ شریف میں حاضر ہوتا ہے تو اس کا یہ سفر ایک طرح سے سفرِ آخرت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس دینی ماحول اور پاکیزہ فضا میں جب وہ مناسک حج ادا کرتا ہے تو اس کی حالت ہی عجیب ہوتی ہے۔ میدان عرفات کے قیام میں اسے وہ بشارت یاد آتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی صورت میں مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام فرمائی ہے۔ اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک خطبے کی بے مثال ہدایات یاد آتی ہیں۔ اسے یہ حکم یاد آتا ہے کہ "میرے بعد گمراہی سے بچنے کے لیے قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔" قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ کی بے نظیر قربانی یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس قربانی کے مقابلے میں میرے نفس کی چھوٹی موٹی خواہشات کی قربانی کی حقیقت ہی کیا ہے؟ میرا تو مرنا جینا بھی اللہ ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ ایسے میں اس کے قلب و ذہن پر یہ کلمات بیساختہ جاری ہو جاتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (سورہ الانعام : 163 ، 164)

ترجمہ:۔ کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے۔ کوئی نہیں اس کا شریک

اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔

مقامِ منیٰ میں وہ اس عزم کے ساتھ اپنے ازلی دشمن شیطان کو کنکریاں مارتا ہے کہ اب اگر یہ میرے اور میرے اللہ کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے گا تو اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کروں گا۔ جب وہ بیت اللہ کے سامنے پہنچتا ہے تو اس کی روح اس خیال سے وجد میں آجاتی ہے کہ جس مقدس گھر کی زیارت کے لیے آنکھیں نمناک تھیں، دل مضطرب تھا وہ آج نظر کے سامنے ہے۔ اللہ سے لو لگائے رکھنے کی یہ کیفیت حاجی کے لیے تسکینِ قلب اور روح کی مسرت کا باعث بنتی ہے طواف کے بعد وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے۔ تو گویا زبان حال سے کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرے قرب سے حاصل ہونے والی اس قوتِ ایمانی کو میں تیرے دین کی سربلندی کے لیے وقف کردوں گا اور عمر بھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔ دل کی یہی تمنا دعا بن کر اس طرح لبوں تک آتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اسْتَعْمِلْنِیْ بِسُنَّۃِ نَبِیِّکَ وَتَوَفَّنِیْ عَلٰی مِلَّتِہٖ وَاَعِذْنِیْ مِنْ مُضِلَّاتِ النَّفْسِ۔

ترجمہ:۔ اے میرے اللہ! مجھے اپنے نبیؐ کے طریقے پر کاربند رکھ اور اس پر عمل کرتے ہوئے مجھے اپنے پاس بلالے۔ اور نفسانی لغزشوں سے مجھے محفوظ فرما دے۔

فوائد

1۔ حج کا اصل فائدہ یادِ الٰہی اور قربِ ربانی ہے لیکن دیگر ارکانِ دین کی طرح اس کے بھی متعدد معاشرتی و اخلاقی فوائد ہیں۔ اس موقع پر دنیا کے مختلف علاقوں سے آنے والے افراد فریضۂ حج کی ادائیگی کی بدولت گناہوں سے پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایمان اور تقویٰ کی پاکیزگی کی جو دولت

لے کر لوٹتے ہیں وہ ان کے ماحول کی بھی اِصلاح کا سبب بن جاتی ہے۔

2 ۔ حج کا یہ عظیم الشان اجتماع ملّت اسلامیہ کی شان و شوکت کا آئینہ دار ہوتا ہے جب دُنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمان رنگ و نسل، قوم و وطن کے امتیازات سے بلند و بالا ہو کر یک زبان ایک ہی کلمہ "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ" دُہراتے ہیں، ایک ہی کیفیت میں سرشار اپنے پروردگار کی پکار پر لپکے جا رہے ہوتے ہیں، تو گویا وہ اللہ کے فداکار سپاہیوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں۔

3 ۔ حج کا ایک اہم تجارتی اور اقتصادی فائدہ بھی ہے کہ مختلف ممالک سے آنے والے حُجّاج خرید و فروخت کے ذریعے معاشی نفع حاصل کرتے ہیں۔

حجِ مقبول

حج کے مذکورہ بالا اِجتماعی و انفرادی فوائد سے ہم اسی صورت میں فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ جب ہمارا مقصد رضائے الٰہی ہو۔ ہماری سرگرمیوں کا مرکز و محور دینِ حق کی سربلندی ہو اور حج کے روحانی مقاصد پر نظر جمی رہے۔ تب ہی ہمارا حج، حجِ مقبول و مَبرُور ہو سکتا ہے۔

جہاد

جہاد کا مفہوم

جہاد کے لغوی معنی کوشش کے ہیں اور دینی اِصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو دین کی حفاظت، فروغ اور اُمتِ مُسلمہ کے دفاع کے لیے کی جائے اللہ تعالیٰ کو اس دُنیا کا حاکم مان لینے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنی زندگی کے جُملہ معاملات میں اس کے احکام کی پیروی کرے۔ نیز اس کے مقابلے میں کسی اور کا حکم نہ چلنے دے۔ اگر کوئی طاقت "اقتدارِ اعلیٰ" اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہے، تو وہ جان پر کھیل کر اس کا مقابلہ کرے۔ اسلام کی جملہ عبادات انسان میں یہی جذبۂ فداکاری پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس جذبے کے بغیر نہ اسلام کی بقاء ممکن ہے، نہ فروغ۔

اقسامِ جہاد

جہاد کی کئی اقسام ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

خواہشِ نفس کے خلاف جہاد: انسان کو اِطاعتِ الٰہی سے روکنے والی پہلی قوت اِنسان کی اپنی خواہشات ہیں۔ جو ہر وقت اس کے دل میں موجزن رہتی ہیں۔ انسان کو ان کی سرکوبی کے لیے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے۔ لہٰذا خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے اور یہ جہاد کا وہ مرحلہ ہے جسے طے کیے بغیر اِنسان جہاد کے کسی اور میدان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

شیطان کے خلاف جہاد: اپنے نفس پر قابو پا لینے کے بعد ان شیطانوں سے نمٹنا ضروری ہوتا ہے جو اللہ کے بندوں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے

بہلا کر اپنی اطاعت اور بندگی پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اس قسم کی ہر قوت کو "طاغوت" کا نام دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (سورہ النساء : 76)

ترجمہ :- جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں سو لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں۔

یہ طاغوتی قوتیں مسلمان معاشرے کے اندر غلط رسم و رواج کی شکل میں بھی پائی جاتی ہیں اور اسلامی معاشرے کے باہر غیر اسلامی ممالک کے غلبے کی شکل میں بھی۔ چنانچہ ان طاغوتی طاقتوں سے نمٹنے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ کہیں ان سے زبان و قلم کے ذریعے نمٹا جاتا ہے، اور کہیں قوت و طاقت کے ذریعے۔ اس بارے میں قرآن مجید ایک جامع ہدایت دیتا ہے۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (سورہ النحل : 125)

ترجمہ :- اور ان سے ایسے انداز میں بحث و تمحیص کرو جو بہت اچھا ہو۔

اگر جہاد کا سچا جذبہ دل میں موجزن ہو تو مومنانہ بصیرت ہر موقع پر مناسب راہیں سُجھا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بہترین رہنمائی کرتا ہے۔

مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم)

ترجمہ :- تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے (قوت سے) روکے۔ اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا سمجھے اور یہ (بدی کو محض دل سے برا سمجھنا) ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

جہاد بالسیف

حق و باطل کی کش مکش میں وہ مقام آکر رہتا ہے۔ جب طاغوتی قوتیں حق کا راستہ روکنے اور اسے مٹانے کے لیے سرد جنگ سے آگے بڑھ کر کھلی جنگ پر اُتر آتی ہیں اور مسلمانوں کو ملی تحفظ اور بقائے دین کے لیے ان سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں :-

اوّل ۔ مُدافعانہ جہاد : اگر کوئی غیر مسلم قوت کسی مسلمان ملک پر حملہ کر دے تو اس ملک کے مسلمانوں پر اپنے دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی خاطر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ مسلمان ممالک اور اسلامی معاشرے کو غیر مسلموں کے تسلط سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں جو بھی کوشش کی جائے گی، وہ جہاد شمار ہو گی۔ مدافعانہ جہاد کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم ریاست کی مسلمان رعایا پر محض اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہو تو عالمِ اسلام اسے ظلم و ستم سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

دوم ۔ مصلحانہ جہاد : جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر اللہ کی حاکمیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِطاعت کا اِقرار کرتا ہے، اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ساری دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت نافذ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد دینِ حق کا قیام بتایا ہے :-

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (سورہ التوبہ : 33)

ترجمہ :- اس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تا کہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر اور پڑے برا مانیں مشرک۔

مزید برآں ارشاد خداوندی ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج

(سورہ الانفال : 39)

ترجمہ:۔ اور لڑتے رہو ان سے، یہاں تک کہ نہ رہے فساد، اور ہو جاوے حکم سب اللہ کا۔

جہاد اور جنگ میں فرق

مُخالفینِ اِسلام ہمارے دین کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ دین تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ مسلمان کی تلوار اور کافر کی شمشیر، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کافر کی جنگ کا مقصد کسی مخصوص فرد، گروہ یا قوم کی ہوسِ ملک گیری، جذبۂ برتری یا مُعاشی غلبے کے جذبے کی تسکین ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر ممکن ظُلم، دہشت گردی اور سفاکی سے کام لیتا ہے اور کامیاب ہو جانے کی صورت میں مفتوحین کی جان و مال اور عزت و آبرو غرض کہ ہر چیز کو غارت کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان کے جہاد کا مقصد انسانوں کو طاغُوتی قُوتوں کے غلبے سے نجات دلانا، ان کے شرف اور ان کی آزادی کو بحال کرنا ہے اس مقصد کے لیے وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ جہاد کا پابند رکھتا ہے جس میں اس کی ذاتی منفعت کا شائبہ تک شامل نہیں ہوتا۔ اس کی تلوار کی زَد محض برسرِ جنگ افراد تک محدود رہتی ہے اور پھر جب وہ فتح حاصل کرتا ہے تو مفتوُح قوم کو اپنے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنانے کے بجائے ان کے لیے اُمن و سلامتی کی فضا فراہم کرتا ہے اور انھیں اِسلام کی برکات سے بہرہ ور کرتا ہے، جس کے تحت تمام انسانوں کے حقُوق یکساں ہیں۔ چنانچہ جب غیر مُسلم رعایا کو مسلمانوں کا نظامِ عدل، نظامِ اخلاق، نظامِ سیاست و حکومت اور نظامِ عبادات پسند آ جاتا ہے، تو وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے ہیں، اور ان کی اس ذہنی تبدیلی کا سہرا تلوار کے سر نہیں۔ بلکہ اِسلامی تعلیمات اور مجاہدینِ اسلام کے اعلیٰ کردار کے سر ہے۔ تلوار کا کام تو صرف اتنا ہے کہ اسلام کے عادلانہ

نظام اور عالمِ اسلام کے درمیان جو لادینی قُوتیں رکاوٹ بنی ہوئی ہوں ان کا صفایا کر دے۔

جہاد کے فضائل

قرآنِ حکیم اور احادیث میں جہاد کے متعدّد فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ

(سورہ الصف : 4)

ترجمہ:۔ بے شک اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر۔ گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے "قسم ہے اللہ کی جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا و مافیہا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور اللہ کی راہ میں دشمن کے مقابل اگر ٹھہرے رہنے کا ثواب گھر میں ستر نمازوں سے زیادہ ہے" بلاشبہ یہ جہاد کی عظمت و فضیلت اور شہادت کی تڑپ ہی کا جذبہ تھا کہ قرُونِ اُولیٰ کے مسلمان دنیا پر چھائے رہے اور دُشمنانِ اِسلام کے دلوں پر ان کی عظمت و شوکت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اللہ کی محبّت واطاعت

اللہ تعالیٰ کے احسانات

اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف زندگی ہی نہیں دی، بلکہ زندگی بسر کرنے کے تمام لوازم بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس کی عنایتوں کا شمار اور اس کے کرم کا حساب ممکن نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْهَا ط (سورہ ابراہیم : 34)

ترجمہ:- اور اگر تم اللہ کے احسانات گنو گے تو شمار نہیں کر سکو گے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ نعمتوں کی یہ کثرت و فراوانی انسان کے دل میں اپنے رحیم و کریم آقا کے لیے وہ جذبۂ محبّت و احسان مندی نہ پیدا کرے جس کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (سورہ البقرہ : 165)

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، انھیں اللہ کے ساتھ زیادہ شدید محبت ہے۔

رسول اللہ کے اِحسانات

اللہ تعالیٰ کے بعد ہماری محبت کے مُستحق اس کے رسول مُحمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی ذاتِ بابرکات کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت دولتِ دین میسّر آئی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "اللہ کی راہ میں جس قدر تکالیف مجھے دی گئیں کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں" اور وہ سب تکالیف آپؐ نے اس غرض سے برداشت کیں کہ اُمت آخرت کی تکالیف سے بچ جائے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی محبّت کے بارے میں ارشادِ نبویؐ ہے:-

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

ترجمہ:- تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اُسے اپنے والدین، اپنی اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبُوب نہ ہو جاؤں۔

شرطِ محبّت - اطاعتِ رسُولؐ

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پہ اطاعتِ رسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:-

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (سورہ آل عمران: 31)

ترجمہ: تو کہہ: اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری پیروی کرو (اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) خود اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اطاعت کی یہ شرط کچھ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے، جتنے انبیاء دُنیا میں بھیجے گئے ان کی بعثت کا بُنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام پر ان کی پیروی کے ذریعے عمل پیرا ہو سکے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (سورہ النساء : 64)

ترجمہ:- اور ہم نے کوئی رسُول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے فرمانے سے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حوضِ کوثر پہ ایسے لوگوں کو حضورِ اکرمؐ کے دیدار سے محروم کر دیا جائے گا، جنہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنے کے بجائے دین میں نئی نئی باتیں نکال لی تھیں۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے

كُلُّ اُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى قِيْلَ وَمَنْ اَبٰى ؟ قَالَ مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى -

ترجمہ:- میرا ہر اُمتی جنت میں جائے گا۔ سوائے اس کے جو انکار کردے۔ عرض کیا گیا کہ انکار کرنے والا شخص کون ہوگا؟ ارشاد فرمایا جو شخص میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ انکار کرنے والا ہوگا۔

حقوق العباد

مُعاشرتی زندگی میں اگر سب لوگوں کو ان کے جائز حقوق ملتے رہیں، تو وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی صلاحیتیں معاشرے کی ترقی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح ماحول خوشگوار بن سکتا ہے، جسے حُسنِ معاشرت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آپس میں ایک دوسرے کا حق مارنے کی روش، بے چینی اور کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے معاشرے کا نظم بگڑتا ہے اور تخریبی رجحانات تعمیری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی انسان کو اپنی ہدایات سے محروم نہیں رکھا۔ اس نے انسانوں کے درمیان حقوق کا واضح تعین کر کے ان کی ادائیگی کو اپنی خوشنودی اور ادا نہ کرنے کو اپنی ناخوشی کا سزاوار ٹھہرایا۔ چنانچہ ایک سچا مسلمان حقوقُ العباد کو بھی حقوقُ اللہ ہی کی طرح محترم سمجھتا اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

والدین کے حقوق

مُعاشرے میں انسان کو جن ہستیوں سے سب سے زیادہ مدد ملتی ہے وہ والدین ہیں۔ جو محض اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ ہی نہیں ہوتے، بلکہ اس کی پرورش اور تربیت کا بھی سامان ہوتے ہیں۔ دُنیا میں صرف والدین ہی کی ذات ہے جو اپنی راحت اولاد کی راحت پر قربان کر دیتی ہے۔ ان کی شفقت، اولاد کے لیے رحمت الٰہی کا وہ سائبان ثابت ہوتی ہے، جو انھیں مشکلاتِ زمانہ کی دھوپ سے بچا کر پروان چڑھاتی ہے۔ انسانیت کا وجود اللہ تعالیٰ کے بعد والدین ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اپنے بعد انہی کا حق ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝

(سورہ الاسراء : 22، 23)

ترجمہ: اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے۔ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے، یا دونوں، تو نہ کہہ ان کو "ہوں!" اور نہ جھڑک ان کو۔ اور کہہ ان سے بات ادب کی۔ اور جھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کے نیازمندی سے، اور کہہ اے رب، ان پر رحم کر، جیسا پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ والدین کا نافرمان شخص جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوڑھے والدین کی خدمت پر بہت زور دیا ہے، کیونکہ وہ اپنی زندگی کی صلاحیتیں اور توانائیاں اولاد پر صرف کر چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے اولاد کا فرض ہے کہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بن کر احسان شناسی کا ثبوت دے۔ ایک بار آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی محفل میں ارشاد فرمایا "ذلیل و خوار ہوا۔ ذلیل و خوار ہوا۔ ذلیل و خوار ہوا"۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔ "کون؟ یا رسول اللہ!" ارشاد فرمایا "وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی"۔

اولاد کے حقوق

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ایک زمانے میں انسان کی سنگ دلی اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتا تھا۔ اسلام نے انسان کے دل میں سوئے ہوئے جذبۂ رحم و

الفت کو جگایا اور دنیا سے قتلِ اولاد کی سنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا۔ اور اولاد کو اپنے والدین سے محبت و شفقت کی نعمت ایک بار پھر ملی۔ قرآن حکیم میں معاشرے کی دیگر برائیوں کے ساتھ قتلِ اولاد سے بھی اِن الفاظ میں منع فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (سورہ الاسراء : 31)

ترجمہ:۔ اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے۔ ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔

ایک صحابیؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "شرک" انھوں نے دریافت کیا "اس کے بعد" آپؐ نے فرمایا "والدین کی نافرمانی" عرض کیا "اس کے بعد" ارشاد ہوا "تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمھارے کھانے میں حصہ بٹائے گی"۔

تعلیماتِ اسلامی کے تحت والدین پر اولاد کے متعدد حقوق عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

1۔ زندگی کا حق۔
2۔ بنیادی ضروریات کی فراہمی، یعنی کھانے پینے، رہائش اور علاج کا حق۔
3۔ حسبِ مقدور تعلیم و تربیت کا حق۔

اگر والدین یہ جملہ حقوق بحسن و بخوبی ادا کرتے رہیں، تو نہ صرف یہ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، بلکہ ان کی اولاد ان کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اولاد کے حقوق کی ادائیگی پر اپنے آرام و آسائش کو مقدم رکھتے ہیں، ان کی اولاد ان کی آخری عمر میں انھیں بے سہارا چھوڑ دیتی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ جہاں اپنی اولاد کو روزی کمانے کے قابل بنانے کی تدبیر کرتے رہیں، وہاں ان میں فکرِ آخرت بھی پیدا کریں اور عملِ صالح کی تربیت دیں اللہ تعالیٰ

نے والدین کی ذمہ داری کو بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (سورہ التحریم : [illegible])

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے۔

بلاشبہ اگر والدین خدا اور رسُول کے حکم کے مطابق اپنی اولاد کے حقوق بطریقِ اَحسن ادا کریں اور اسے نیکی کی راہ پہ لگائیں، تو نہ صرف یہ کہ وہ دُنیا میں ان کی راحت کا سامان بنے گی، بلکہ آخرت میں بھی ان کی بخشش کا ذریعہ ہوگی۔

میاں بیوی کے باہمی حقُوق

مُعاشرے کی بُنیادی اِکائی گھر ہے، اور گھر کے سکون اُور خوشحالی کا اِنحصار میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات پر ہے۔ اس کی عمدگی محض دو افراد ہی کی نہیں، بلکہ دو خاندانوں اور اس کے نتیجے میں پورے معاشرے کی شادمانیوں کا سبب بنتی ہے۔ اگر ان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو یہ صورتِ حال بہت سے رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زوجین کے حقُوق کا تعیّن فرماتے ہوئے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے :۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ

(سورہ البقرہ : 228)

ترجمہ:۔ اور عورتوں کا بھی حق ہے۔ جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے۔ دستور کے موافق، اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے۔

لیکن یہ درجہ محض گھر کا انتظام ایک زیادہ باہمت، حوصلہ مند اور قوی شخصیّت کے سپُرد کرنے کے لیے ہے، عورتوں پر ظلم روا رکھنے کے لیے نہیں۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے خواتین کا شرف بحال کیا اور مردوں کو ان پر حکومت کا اختیار دینے کی بجائے ان کی حفاظت کی ذمہ داری سپُرد کی اور تلقین کی کہ بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک

کو خیر اور اچھائی کا معیار بتایا۔ ارشاد فرمایا :

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ

ترجمہ :۔ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔

ایک بار ایک صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسُول اللہؐ! بیوی کا اپنے شوہر پر کیا حق ہے؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا: "جو خود کھائے اسے کھلائے۔ جیسا خود پہنے، ویسا اسے پہنائے۔ نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اسے بُرا بھلا کہے" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیویوں کے حقوق کا اتنا خیال تھا کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں ان سے حُسنِ سلوک کی تلقین فرمائی۔ دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے نیک بیویوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا :۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (سورہ النساء : 34)

ترجمہ :۔ پس جو عورتیں نیک ہیں، فرمانبردار ہیں، نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے۔

جہاں مرد کو مُنتظمِ اَعلیٰ کی حیثیت سے بیوی بچّوں کی کفالت اور حفاظت کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ وہاں عورتوں کو پابند کیا گیا کہ وہ مردوں کی وفادار اور اِطاعت گزار بن کر رہیں۔ ایک مسلمان بیوی کے لیے شوہر کی جو حیثیت ہوتی ہے، اس کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے ہوتا ہے "اگر میں خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدے کا حکم دیتا تو بیوی سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے"۔ شوہر کو بھی نصیحت کی گئی ہے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوی پر سختی نہ کرے، بلکہ اگر اس میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہوں تو درگزر کرے اور اس کی خوبیوں کی قدر کرے۔ اس بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ (سورہ النساء : 19)

ترجمہ: اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح۔ پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں۔ تو شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس

میں بہت خوبی۔

اس بات کی تشریح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارک سے ہوتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ۔ اگر تم غور کرو گے تو تمھیں ان میں کوئی اچھائی بھی ضرور نظر آجائے گی"

ترجمہ: اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی سے دیا کرو اور اگر وہ اپنی خوشی سے اس سے کچھ تمہیں چھوڑ دیں تو اسے ذوق و شوق سے کھالو۔ (النساء:4)

ترجمہ: جو مال ماں باپ اور رشتے دار چھوڑ کر مریں تھوڑا ہو یا بہت۔ اس میں مردوں کا بھی حصّہ ہے اور عورتوں کا بھی۔ یہ حصّے خُدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ (النساء:7)

رشتہ داروں کے حقُوق

والدین اور اُولاد اور شریکِ حیات (بیوی) کے حقُوق کے بعد اِسلام رشتہ داروں کے حقُوق پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں انسان کا واسطہ اہلِ خانہ کے بعد سب سے زیادہ انہی سے پڑتا ہے۔ اگر خاندان کے افراد ایک دوسرے کے حقُوق اچھے طریقے سے ادا کرتے رہیں تو پورے خاندان میں محبت اور اپنائیت کی فضا قائم ہو گی، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو نفرت اور دوری پیدا ہو جائے گی، اور آئے دن کے جھگڑوں سے خاندان کا سکون برباد ہو کر رہ جائے گا۔ اور پورا معاشرہ امن سے محروم ہو جائے گا۔ قرآن اور حدیث دونوں میں صلۂ رحمی یعنی رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کی بار بار تلقین کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (سورہ الاسراء: 26)

ترجمہ:۔ رشتہ دار کو اس کا حق دو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ

ترجمہ:۔ رشتہ داروں سے تعلق توڑنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی ضروریات کا خیال رکھیں، تاکہ انھیں غیروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ تلقین کی گئی ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس میں ترجیح اپنے رشتہ داروں کو دو اور پھر ان کے ساتھ جو سلوک کرو اس پر انھیں طعنے دے کر اپنے اجر و ثواب کو برباد نہ کرو۔ انھیں احساسِ تنہائی اور احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دو۔ ان کی شادی، غمی میں شریک ہو۔ رشتے داروں کے ذریعے امداد کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی اور مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ جب کہ غیروں سے مدد طلب کرنے میں اپنی ہی نہیں، خاندان کی عزت بھی گھٹتی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص اللہ اور رسولؐ کی ہدایات کے مطابق اپنے رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھے تو معاشرہ بہت سی خرابیوں سے محفوظ رہے گا۔

اساتذہ کے حقُوق

اسلام نے جہاں مسلمانوں پر حصُولِ علم کو فرض قرار دیا، وہاں اُستاد کو بھی ایک باعزت مقام عطا کیا۔ تاکہ اس کی وجاہت سے علم کا وقار بڑھے اور علم سے انسانیت کا۔ استاد کا یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اسے اس پیشے کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ جیسا کہ ارشادِ رسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

ترجمہ:۔ مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

استاد علم دے کر نئی نسل کی صحیح نشو ونما اور اس کے فکر و نظر کی اصلاح کرتے ہیں۔ نئی نسل انہی کے فراہم کردہ سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ استاد کے اعزاز و احترام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تیرے تین باپ ہیں، ایک وہ جو تجھے عدم سے وجود میں لایا، دوسرا وہ جس نے تجھے اپنی بیٹی دی، تیسرا وہ جس نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔"

مُعلّم کی حیثیت علم کی بارش کی سی ہوتی ہے۔ اور طلبہ کی حیثیت زمین کی جو زمین بارش کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ بارش کے فیض سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اسی طرح جو شاگرد اپنے استادوں کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہ علم کے ثمرات سے مستفید ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ اور ظرف بھی، والدین کے علاوہ صرف استاد ہی کا ہوتا ہے، کہ وہ اپنے شاگرد کو خود سے آگے بڑھتے دیکھ کر حسد کرنے کی بجائے خوش ہوتا ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ اپنے طلبہ کی کامیابیوں کو اپنی ہی کامیابیاں سمجھتا ہے۔ مسلمانوں میں استاد کی احسان شناسی اور احترام کا اندازہ کچھ اس رواج سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شاگرد استاد کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا لیتے تھے، اور اس طرح لائق شاگردوں کے ذریعے استاد کا نام زندہ رہتا تھا۔

ہمسایوں کے حقوق

انسان کو روزمرہ زندگی میں اپنے ہمسایوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی تکلیف یا بیماری کے وقت پڑوسی ہی وہ شخص ہوتا ہے جس کی مدد سب سے پہلے اور آسانی دستیاب ہوتی ہے۔ جب کہ عزیز و اقارب تو اطلاع ملنے پر بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔ مسجد میں نماز کی ادائیگی کے وقت بھی پڑوسی سے روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔ پڑوسی اور اس کے اہل و عیال کے اخلاق و کردار سے خود ہمارے گھر والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر پڑوسی بُرا ہو تو اس سے انسان کا ناک میں دم آ جاتا ہے۔ اسلام

نے پڑوسی کے حقوق پر بڑا زور دیا ہے اور پڑوسیوں کی تین قسمیں الگ الگ بیان کر کے ان سب سے حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے:-

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ

(النساء : 36)

یعنی

وہ پڑوسی جو رشتے دار بھی ہو۔

وہ پڑوسی جو ہم مذہب یا رشتے دار نہ ہو۔

عارضی پڑوسی مثلاً ہم پیشہ، ہم جماعت، شریکِ سفر یا ایک ہی جگہ ملازمت یا کاروبار کرنے والے۔

ہمسایوں سے حُسنِ سلوک کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ چند ارشادات درج ذیل ہیں:-

(الف) وہ شخص مومن نہیں جو اپنے ہمسائے کی بھوک سے بے نیاز ہو کر شکم سیر ہو۔

(ب) تم میں سے افضل وہ ہے جو اپنے ہمسائے کے حق میں بہتر ہے۔

(ج) اگر پڑوسی کو مدد کی ضرورت پڑے تو اس کی مدد کرو۔ قرض مانگے تو اسے قرض دو۔ محتاج ہو جائے تو اس کی مالی امداد کرو۔ بیمار پڑ جائے تو علاج کرواؤ۔ اور مر جائے تو جنازے کے ساتھ قبرستان جاؤ۔ اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرو۔ اگر اسے کوئی اعزاز حاصل ہو تو اسے مبارکباد دو۔ اگر مصیبت میں مبتلا ہو جائے، تو اس سے ہمدردی کرو۔ بغیر اجازت اپنی دیوار اتنی اُونچی نہ کرو کہ اس کے لیے روشنی اور ہوا رک جائے۔ کوئی میوہ یا سوغات وغیرہ لاؤ تو اسے بھی بھیجو۔

(د) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اتنی شدت سے تاکید فرماتے تھے کہ ہم یہ سوچنے لگے کہ شاید میراث میں بھی پڑوسیوں کا حصہ رکھ دیا جائے گا۔ (بخاری - ادب)

(ھ) ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں ایک عورت کا ذکر آیا کہ وہ بڑی عبادت گزار اور پرہیزگار ہے۔ دن میں روزے رکھتی ہے اور رات کو تہجد ادا کرتی ہے لیکن پڑوسیوں کو تنگ کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا " وہ دوزخی ہے "۔ ایک دوسری عورت کے بارے میں عرض کیا گیا کہ وہ صرف فرائض (عبادات) ادا کرتی ہے لیکن ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا " وہ جنتی ہے "۔

(و) حضورؐ نے تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص کامل مومن نہیں جس کی شرارتوں اور اذیتوں سے اس کے پڑوسی امن میں نہ ہوں۔

غیر مسلموں کے حقوق

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات کی صراحت فرما دی ہے کہ کافر اور مشرک ہرگز ہرگز مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ صرف اِسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے سے شہری حقوق عطا کرتا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ ان سے شفقت آمیز برتاؤ کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

(سورہ المائدہ : 8)

ترجمہ :۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار غیر مسلموں سے ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا ایک ڈاکٹر مریض سے کرتا ہے۔ اسی حُسنِ سلوک سے مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے دل جیتے۔

معاشرتی ذمہ داریاں

اسلام انسانی معاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے اخلاقِ حسنہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور مسلمانوں کے لیے اَخلاقی قدروں کی پاسداری کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اس سلسلے میں چند محاسنِ اخلاق کا ذکر کیا جاتا ہے :۔

دیانت داری

معاشی اور معاشرتی تعلقات کی استواری کے لیے دیانت ایک بُنیادی شرط ہے، جس معاشرے سے دیانت داری ختم ہو جائے وہاں کاروباری معاملات سے لے کر گھریلو تعلقات تک، ہر جگہ ناقابلِ اِصلاح بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور ایک دوسرے سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اسلام اپنے نام لیواؤں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے دیانت داری کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (سورہ النساء: 58)

ترجمہ :۔ بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو۔

نیز جہاں دُنیا و آخرت کی فلاح حاصل کرنے والوں کی دیگر صفات بتائی گئی ہیں، وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے :

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (سورہ المومنون: 8)

ترجمہ :۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کی نگہبانی کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے قبل بھی عرب کے بد دیانت معاشرے میں "اَلْاَمِیْنُ" یعنی دیانت دار کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِحساسِ دیانت کا یہ عالم تھا کہ مدینے ہجرت کرتے وقت بھی ان لوگوں

کی امانتوں کی ادائگی کا اہتمام فرمایا۔ جو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قتل کے درپے تھے۔ اسلام نے دیانت کے مفہوم کو محض تجارتی کاروبار تک محدود نہیں رکھا، بلکہ وسعت دے کر جملہ حقوقِ العباد کی ادائیگی کو دیانت کے دائرے میں شامل کر دیا۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "محفل میں کی جانے والی باتیں بھی امانت ہیں۔" یعنی ایک جگہ کوئی بات سن کر دوسری جگہ جاسنا نا بھی بددیانتی میں داخل ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی امانتیں سمجھیں، اور ان سب کو اس احساس کے ساتھ استعمال کریں کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کو ان کا حساب دینا ہے۔ دیانت کی اس تعریف کے پیشِ نظر ناممکن ہے کہ کوئی شخص مسلمان بھی ہو اور بددیانت بھی۔ اسی لیے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:۔

"جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔"

اِیفائے عہد

انسانوں کے باہمی تعلقات میں اِیفائے عہد یعنی وعدہ پورا کرنے کو جو اہمیّت حاصل ہے، وہ مُحتاجِ بیان نہیں۔ ہمارے اکثر معاملات کی بُنیاد وعدوں پر ہوتی ہے وہ پورے ہوتے رہیں تو معاملات ٹھیک رہتے ہیں۔ اگر ان کی خلاف ورزی شروع ہو جائے تو سارے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ اسی بگاڑ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اِسلام اِیفائے عہد کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (سورہ الاسراء: 34)

ترجمہ:۔ اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔

انسان کے تمام وعدوں میں اہم ترین عہد وہ ہے، جو اس نے یومِ اَزل بندگی کے معاملے میں اپنے خالق سے کیا تھا۔ قرآن عظیم نے اس کی یاد دہانی اس انداز سے کرائی ہے:۔

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

(سورہ الانعام: 153)

ترجمہ:۔ اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

ایک اور مقام پر باہمی معاہدوں اور اجتماعی رشتوں کی پاسداری کا لحاظ رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (سورہ الرعد 21،20)

ترجمہ:۔ وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جن کو اللہ نے فرمایا ملانا۔

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے سخت سے سخت حالات میں بھی عہد کی پابندی فرمائی۔ مثلاً جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابوجندلؓ زنجیروں میں جکڑے ہوئے آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنے جسم کے داغ دکھائے کہ اہلِ مکہ نے انھیں مسلمان ہو جانے پر کتنی اذیت دی ہے اور درخواست کی کہ انھیں مدینہ ساتھ لے جایا جائے، تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس شفقت کے باوصف، جو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو مسلمانوں سے تھی۔ انھیں اپنے ہمراہ مدینے لے جانے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ قریش سے معاہدہ ہو چکا تھا، کہ مکہ سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں کو مدینے سے لوٹا دیا جائے گا۔ حضرت ابوجندلؓ کی دردناک حالت تمام صحابہ کرامؓ کے لیے بے قراری کا باعث تھی، لیکن صلح نامہ حدیبیہ کی پاسداری کے پیشِ نظر سب نے صبر و تحمّل سے کام لیا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اپنے خطبوں میں اکثر یہ بات فرماتے تھے:

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: جسے وعدے کا پاس نہیں اس میں دین نہیں۔

ہمارے لین دین کے جملہ معاملات اور باہمی حقوق ایفائے عہد ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے دین داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب کی پاسداری کریں۔

سچائی

سچائی ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر انسان سُکھ چین کا سانس نہیں لے سکتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو نہایت جامعیت کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا۔

اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُہْلِکُ

ترجمہ:۔ سچائی انسان کو ہر آفت سے محفوظ رکھتی ہے اور جھوٹ اسے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ نے اپنے صادق القول ہونے کا ذکر فرمایا۔ مثلاً:۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا (سورہ النساء : 87)

ترجمہ: اور اللہ سے سچی کس کی بات ہے

اسی طرح قرآنِ حکیم میں انبیاء کی اس صفت کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہ راست گفتار تھے۔ سچائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ تمام انبیاء نے وہیں سے سچائی حاصل کی اور دنیا میں پھیلائی۔ اس سچائی سے انکار کرنے والا زندگی کے ہر معاملے میں جھوٹ اور باطل کی پیروی کرتا ہے، اور ہلاک ہو کر رہتا ہے۔ اُردو میں ہم سچ کا لفظ محض گفتگو کے تعلق سے استعمال کرتے ہیں، لیکن قرآن مجید کے مفہوم میں قول کے ساتھ عمل اور خیال تک کی سچائی شامل ہے۔ یعنی صادق وہ ہے جو نہ صرف زبان ہی سے سچ بولے بلکہ اس کے فکر و عمل میں بھی سچائی رچی بسی ہو۔

عدل وانصاف

نظامِ عدل کی موجودگی میں معاشرے کے امور بخیر و خوبی سرانجام پاتے ہیں اور بے انصافی کی وجہ سے معاشرے کا ہر شعبہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل دُنیا عدل وانصاف کے تصور سے خالی ہو چکی تھی۔ طاقتور ظلم وستم کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے اور کمزور اپنی مظلومیت کو مُقدر سمجھ کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ دینِ اسلام کے طُفیل ظلم وستم کا یہ کاروبار بند ہوا اور دُنیا عدل وانصاف کے اس اعلیٰ معیار سے آشنا ہوئی جس نے رنگ ونسل اور قوم ووطن کے امتیازات کو مٹا کر رکھ دیا۔ ناانصافی کی بناء پر انسانوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان نفرت کی جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی، اسلام نے اسے گرا کر انسان کو انسان کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ اس طرح لوگوں کے درمیان انس ومحبت کا وہ رشتہ استوار ہوا جو انسانیت کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عدل وانصاف کے معاملے میں بلا امتیاز تمام نسلِ انسانی کے درمیان مساوات قائم کرنے کا حکم دیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (سورہ المائدہ : 8)

ترجمہ: اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

رنگ ونسل کی طرح اِسلام کے تصورِ عدل میں کسی کے اعلیٰ منصب اور مرتبے کو کوئی اہمیت نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ ارشادات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی خاتون کی چوری سے متعلق سزا کی معافی کی سفارش سن کر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم سے پہلے قومیں اسی سبب سے برباد ہوئیں، کہ ان کے چھوٹوں کو سزا دی

تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔"

اسلامی حکومت کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنے باشندوں کو ہمیشہ بے لوث انصاف فراہم کیا ہے اور حقیقت میں اِسلامی حکومت کا اَصل مقصد ہی نظامِ عدل کا قیام ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سلطانِ عادل کو خدا کا سایہ قرار دیا۔

اِحترامِ قانون

جس طرح قدرت کا نظام چند فطری قوانین کا پابند ہے، اسی طرح معاشرے کا قیام و دوام، معاشرتی، اَخلاقی اور دینی احکام و قوانین پر موقوف ہے۔ یوں تو دُنیا کا کم عقل انسان بھی قانون کی ضرورت، اس کی پابندی اور اہمیت کا اعتراف کرے گا، لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو عملاً قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ عصرِ حاضر میں دو افراد کے باہمی معاملات سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک لوگ ضابطے اور قانون کی پابندی سے گریزاں ہیں، اور لاقانونیت کے اس رُجحان نے دُنیا کا اَمن و سکون غارت کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان قانون کی افادیت کا قائل ہونے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ اس کی دو اہم وجوہ ہیں:۔

ایک خود غرضی اور مفاد پرستی۔

دوسرے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنا۔

اسلام ان دونوں وجوہ کا خُوبی سے تدارک کر کے مسلمانوں کو قانون کا پابند بناتا ہے۔ ایک طرف وہ انھیں خدا پرستی اور ایثار و سخاوت کا درس دیتا ہے دوسری طرف ان میں آخرت کی جواب دہی کا اِحساس و شعور پیدا کرتا ہے۔ اِسلام انھیں اِحساس دلاتا ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ یا دھوکے فریب سے دنیا میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ بھی گئے تو آخرت میں انھیں خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آخرت میں جواب دہی کا یہی اِحساس اسلامی معاشرے کے گناہ میں ملوّث ہو جانے والے افراد

کو از خود عدالت میں جانے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ انھیں دُنیا ہی میں سزا دے کر پاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائیں۔

لوگوں کے دلوں میں قانون کے احترام کا سچا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود حکمران طبقہ بھی قانون کی پاسبانی کرے اور اپنے اثر و رسوخ کو قانون کی زد سے بچنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ آج دُنیا کا شاید ہی کوئی دستور یا آئین ایسا ہو، جس میں حکمران طبقے کو مخصوص مراعات مہیا نہ کی گئی ہوں، اور قانون میں آقا و غلام اور شاہ و گدا کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اِسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو گئی اور ایک یہودی کے پاس ملی۔ خود خلیفۂ وقت ہونے کے باوصف آپ اسے قاضی کی عدالت میں لے گئے اور جب اس نے آپ کے بیٹے اور غلام دونوں کی گواہی ان سے قریبی تعلق کی بناء پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ دعویٰ سے دستبردار ہو گئے۔ اِحترامِ قانون کی اس مثال نے یہودی کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

کسبِ حلال

کسبِ حلال کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا

(سورہ المومنون : 51)

ترجمہ:۔ "اے رسولو! کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا۔"

اسی طرح تمام انسانوں کو تلقین فرمائی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (سورہ البقرہ: 168)

ترجمہ:۔ "اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ۔"

مزید برآں مسلمانوں کو خصوصی تاکید کی گئی:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

(سورہ البقرہ : 172)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو۔

اسلام میں عبادات اور معاملات کے ضمن میں کسبِ حلال کو بے حد اہمیّت حاصل ہے۔ اس لیے عبادات کی مقبولیت کے لیے کسبِ حلال کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (سورہ البقرہ : 188)

ترجمہ:۔ اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق۔

جس معاشرے میں ناجائز ذرائع آمدنی یعنی ناانصافی، بددیانتی، رشوت ستانی، سود خوری، چوری، ڈاکہ زنی، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی اور سٹے بازی کا رواج عام ہو جائے تو اس معاشرے کی کشتی تباہی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور بربادی اس معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے۔ اسلام ہر معاملے میں کسبِ معاش کے ان تمام غلط طریقوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور ناجائز ذرائع کے اختیار کرنے والوں کو جہنم کی خبر دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے "حرام رزق پر پلنے والے جسم کو جہنم ہی کا ایندھن بننا چاہیے"۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر یقین ہوگا۔ وہ کبھی جائز وسائل کو چھوڑ کر ناجائز ذرائع کا رُخ نہیں کرے گا، خواہ ان میں کتنی ہی دلکشی کیوں نہ ہو۔ البتہ جو شخص اس شیطانی وسوسے میں مبتلا ہو کہ میں ناجائز ذرائع سے اپنے مقدر سے زیادہ کما سکتا ہوں، وہی حرام طریقوں کا سہارا لے گا۔ شیطان کے اس حربے کو ناکام بنانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ معیارِ زندگی کا ڈھونگ رچانے کی بجائے سادگی، کفایت شعاری، میانہ روی اور قناعت پسندی کے اصولوں پر کاربند رہا جائے۔

ایثار

دنیا پرستی اگر انسان کو خود غرضی اور مفاد پرستی سکھاتی ہے تو دین داری اس میں

جذبہ ایثار پیدا کرتی ہے۔ وہ خود تکلیف اٹھا کر مخلوقِ الٰہی کو راحت و آرام پہنچاتا ہے۔ اس کا عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پائے گا اور اُخروی نعمتوں کے حصول کا سبب بنے گا۔

دیگر محاسنِ اخلاق کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایثار و سخاوت کا بہترین نمونہ تھے اور سربراہِ مملکت ہوتے ہوئے بھی انتہائی سادگی اور جفاکشی کی زندگی گزارتے تھے۔ خانۂ مبارک میں ہفتوں چولہا نہیں جلتا تھا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر سے کوئی سائل محروم نہیں لوٹا۔ اپنے پاس کچھ موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر حاجت مند کی حاجت پوری کرتے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جانور ذبح فرمایا، اور گوشت تقسیم کی غرض سے گھر بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد گھر میں آکر دریافت فرمایا: کتنا تقسیم ہوگیا ہے اور کتنا بچا۔ عرض کیا گیا کہ عمدہ قسم کا گوشت تقسیم ہوگیا اور خراب قسم کا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اور جو تقسیم ہو گیا ہے، وہ رہ گیا اور جو باقی بچا ہے، حقیقت میں وہ چلا گیا ہے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم بھی جذبۂ ایثار سے سرشار تھے اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی حاجت کو ترجیح دیتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ رومیوں کے مقابلے میں جانے والی فوج کے ساز و سامان کے لیے مسلمانوں سے مالی اعانت طلب کی گئی تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ گھر کا سارا سامان لے آئے۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں باہر سے آنے والا غلہ دوگنے، چوگنے منافع کی پیش کش کرتے ہوئے خریدا، اور بلامعاوضہ تقسیم کر دیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایثار کے سلسلے میں ایک واقعہ بڑا اثر انگیز ہے۔ ایک بار کوئی بھوکا پیاسا شخص حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دولت کدے پر پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حسبِ دستور ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ آپؐ کے مہمان کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ گھر پہنچ کر بیوی سے معلوم ہوا کہ کھانا صرف بچوں کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر فاقے

کی حالت میں سلادو اور کھانا شروع کرتے وقت کسی بہانے چراغ بجھا دینا تاکہ مہمان کو یہ اندازہ نہ ہوسکے کہ ہم کھانے میں شریک نہیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ مہمان نے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا اور انصاری کا یہ پورا گھرانا بھوکا سویا۔ صبح جب یہ صحابی رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ جل شانہٗ تمہارے رات کو حُسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا۔ ایسے ہی ایثار پیشہ لوگوں کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۛ

(سورہ الحشر: 9)

ترجمہ: اور وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود فاقے ہی سے کیوں نہ ہوں۔

ہجرت کے موقع پر اَنصارِ مدینہ نے مُہاجرینِ مکہ کے ساتھ حُسنِ سلوک کے سلسلے میں جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔

اَخلاقی رذائل

جس طرح اَخلاقِ حَسنہ کی ایک طویل فہرست ہے، جن کو اپنا کر آدمی دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسے اَخلاق رذیلہ ہیں جن کو اختیار کرکے انسان حیوانی درجے میں جاگرتا ہے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اَخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہوں اور اَخلاقِ رذیلہ سے بچیں، جو انسان کی شخصیت کو داغ دار کردیتے ہیں اور اُسے ہر قسم کی نیکی اور بھلائی سے محروم کردیتے ہیں۔ چند اَخلاقِ رذیلہ کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جھوٹ

جھوٹ نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک بُرائی ہے، بلکہ بہت سی دوسری

اَخلاقی برائیوں کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسلام میں جھوٹ بولنے کی سختی سے مذمّت کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔ اِسی طرح اِرشادِ باری تعالیٰ ہے کہ جھوٹے آدمی کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (سورہ الزمر: 3)

ترجمہ: البتہ اللہ راہ نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا حق نہ ماننے والا ہو۔

اسی لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مومن کی فطرت میں ہر خصلت ہوسکتی ہے، مگر خیانت اور جھوٹ کی خصلت مومن میں ہرگز ممکن نہیں۔

(رواہ البیہقی عن سعد بن ابی وقاص)

مسند احمد میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی شخص نے دریافت کیا: "یا رسُول اللہ! جنت میں لے جانے والا کون سا عمل ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے۔ اس سے اس کے ایمان میں اِضافہ ہوتا ہے اور ایمان میں یہ اضافہ جنت میں داخلے کا سبب بنتا ہے۔" اس شخص نے دریافت کیا۔ "یا رسُول اللہ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟" فرمایا: "جھوٹ بولنا۔ جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا۔ جب گناہ کے کام کرے گا تو گویا کفر کرے گا اور یہ کفر اسے جہنم میں لے جائے گا۔" جھوٹ کا تعلق محض زبان سے نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ناپسندیدہ اعمال بھی جھوٹ کی تعریف میں آتے ہیں۔ مثلاً غلط طریقے سے کسی کا مال ہتھیانا، کم تولنا، غرور کرنا، منافقت سے کام لینا وغیرہ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمود و نمائش کو بھی جھوٹ کی ایک قسم قرار دیا۔ جھوٹ کے نتیجے میں باہمی اعتماد نہیں رہتا۔ انسان کی ساکھ ختم ہوجاتی ہے اور معاشرتی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جھوٹ کی ہر قسم سے پرہیز کریں۔

غیبت

اَخلاقی بیماریوں میں غیبت جس قدر بُری بیماری ہے بدقسمتی سے ہمارے معاشرے

میں اسی قدر عام ہے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اس بیماری سے محفوظ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس گناہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ (سورہ الحجرات : 12)

ترجمہ :۔ اور بُرا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو، بھلا خوش لگتا ہے۔ تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو، تو گھن آتی ہے تم کو اس سے۔

غیبت کے لیے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کی تمثیل اِنتہائی بلیغ ہے۔ کیونکہ جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے، وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اس طرح غیبت سے باہمی نفرت کو ہوا ملتی ہے اور دشمنی کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ غیبت کے مرض میں مبتلا شخص خود کو عموماً عیبوں سے پاک تصوّر کرنے لگتا ہے، اور جس کی غیبت کی جائے وہ اپنے عیب کی تشہیر ہو جانے کے باعث اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ غرض غیبت ہر لحاظ سے معاشرتی سکون کو برباد کرتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کے واقعات بیان کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا کہ میں نے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ لوگ اس سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت و آبرو بگاڑتے ہیں (یعنی غیبت کرتے ہیں)

شریعتِ اِسلامی میں غیبت صرف دو صورتوں میں جائز قرار دی گئی ہے۔ ایک مظلوم کی ظالم کے خلاف فریاد کی شکل میں اور دوسرے لوگوں کو کسی فریب کار کی فریب کاری سے آگاہ کرنے کے لیے۔ بعض علماء نے نقل اتارنے اور تحقیر آمیز اشارات کرنے کو بھی غیبت میں شمار کیا ہے۔

غیبت و اِتّہام کا فرق

غیبت اور اِتہام میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ غیبت سے مراد کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی ایسی برائی بیان کرنا ہے، جو اس میں موجود ہے، جب کہ تہمت لگانے سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا ایسا عیب بیان کیا جائے جو اس میں موجود نہ ہو اور اس کے دامنِ عفت کو بلاوجہ داغ دار بنایا جائے۔

منافقت

عُلمائے اِسلام نے منافق کی دو اَقسام بیان کی ہیں۔ ایک وہ منافق جو دل سے اسلام کی صداقت و حقانیت کا قائل نہیں، لیکن کسی مصلحت یا شرارت کی بناء پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اسے اعتقادی منافق کہتے ہیں۔ دوسرا وہ منافق ہے جو اگرچہ خلوصِ نیت سے اسلام قبول کرتا ہے لیکن بعض بشری کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے عملی احکام پر چلنے میں تساہل یا کوتاہی کرتا ہے۔ اسے عملی منافق کہتے ہیں۔ پہلی قسم کا منافق کافروں سے بدتر ہے، جب کہ دوسری قسم کا منافق صاحبِ ایمان ضرور ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت ابھی ناقص ہے جو کسی مُعلّم و مربّی کے فیضانِ صُحبت سے اسے حاصل ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف منافقوں کی سب سے خطرناک چال یہ ہوتی ہے کہ وہ دین داری کے پردے میں مسلمانوں کو باہم لڑا دیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے مدینے میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل مسجد ضرار تعمیر کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسجد کو مسمار کرا کے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ (سورہ التحریم : 9)

ترجمہ:- اے نبی! لڑائی کر منکروں سے اور دغا بازوں سے اور سختی کر ان
پر اور ان کا گھر دوزخ ہے۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافق کی پہچان بتاتے ہوئے ارشاد
فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

1۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔
2۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔
3۔ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے چاہے وہ نماز اور روزے کا پابند ہو، وہ منافق
ہی ہے۔ قرآن مجید میں ان منافقوں کے انجام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ دوزخ
کے سب سے نچلے اور تکلیف دہ حصے میں رکھے جائیں گے۔

تکبّر

تکبر کے معنی خود کو بڑا اور برتر سمجھنے اور ظاہر کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعے
سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے شیطان نے تکبر کیا اور کہا کہ میں آدم
علیہ السلام سے افضل ہوں۔ اس لیے ان کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے
جواب میں فرمایا تھا:۔

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ

(سورہ الاعراف: 13)

ترجمہ:- تو اتر یہاں سے۔ تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں۔ پس باہر
نکل تو ذلیل ہے۔

وہ دن اور آج کا دن، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا چلا آیا ہے۔ اور فرمانِ الٰہی
کے مطابق، آخرت میں بھی متکبر انسانوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْمُتَكَبِّرِينَ ○ (سورہ الزمر: 60)

ترجمہ:- کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانہ غرور کرنے والوں کا۔

تکبر کی مذمت فرماتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"جس کے دل میں رائی برابر بھی غرور اور تکبر ہوگا وہ انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا۔"
مغرور و متکبر انسان دوسروں کو حقیر سمجھ کر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور گناہوں پر
بے باک ہو جاتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا کون دے سکتا
ہے۔ اسی لیے وہ مُروت، اخوت، ایثار اور اس قسم کی سبھی بھلائیوں سے محروم ہو
جاتا ہے۔

حسد

انسان دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی کو اچھی حالت میں دیکھیں تو
خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے لیکن حسد وہ بُری خصلت
ہے۔ جو کسی کو خوش حال اور پُرسکون دیکھ کر انسان کو بے چین کر دیتی ہے، اور وہ اپنے
بھائی کی خوشحالی دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے دل ہی دل میں جلتا اور کُڑھتا ہے۔
ایسا کرنے سے وہ دوسروں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا، خود اپنے لیے پریشانی مول لے لیتا
ہے۔ یوں تو حسد ایک اخلاقی بیماری ہے لیکن اس کے نتیجے میں انسان کئی دوسری
اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ دوسروں کو بہتر حالت میں دیکھنے
کا روادار نہیں ہوتا تو اپنے بہت سے عزیزوں سے ترکِ تعلق کر لیتا ہے جو ایک
ناپسندیدہ بات ہے۔ اسی طرح جس شخص کی طبیعت میں حسد پیدا ہو جائے، وہ کبھی
قانع نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے برتر کو دیکھ کر اپنی حالت زار پر کفِ افسوس ملتا
رہتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اپنی حالت بہتر بنانے پر صرف ہو سکتی ہیں، ہمیشہ
دوسروں کی حالت کو بگاڑنے ہی کی فکر میں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ حاسد اپنی بھڑکائی
ہوئی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے۔ گو اسلام اپنے پیروکاروں کو باہمی محبت اور
احسان کی تلقین کرتا ہے، تاکہ معاشرتی اعتبار سے اجتماعی فلاح حاصل ہو سکے

لیکن حاسد کے دل میں سوائے نفرت اور جلن کے کوئی شریفانہ جذبہ جگہ نہیں پاسکتا۔
اجتماعی فلاح کے معانی یہ ہیں کہ معاشرے کے جملہ افراد معزز اور خوشحال ہوں۔ لیکن حاسد لوگوں کی نیک نامی اور خوشحالی کو ذلت و خواری میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہے۔ پس ایک نہ ایک دن وہ معاشرے کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسد سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد فرمایا:-

إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔

ترجمہ:- دیکھو! حسد سے بچو۔ کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے۔ جیسے آگ خشک لکڑی کو۔

اگر انسان حسد اور اس جیسے دوسرے اخلاقِ رذیلہ سے بچنا چاہتا ہے تو اسے رسول پاکؐ، صحابہؓ اور بزرگانِ دین کی سادگی و قناعت کی تاریخی مثالوں سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے، اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی چاہیے کہ دولت و اقتدار سے پیدا ہونے والی برائیوں اور مفاسد پر نظر رکھے۔

سوالات

1۔ ارکانِ اسلام سے کیا مراد ہے؟ فرد کی تعمیرِ سیرت اور معاشرے کی تشکیل میں نماز کیا کردار ادا کرتی ہے؟

2۔ روزے کے مقاصد بیان کریں اور عملی زندگی پر اس کے اثرات تفصیل سے لکھیں۔

3۔ "اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔" اس موضوع پر مفصل اظہارِ خیال کریں۔

4۔ حج کا فلسفہ کیا ہے؟ نیز اس کے انفرادی اور اجتماعی فوائد بیان کریں۔

5۔ جہاد سے کیا مراد ہے؟ اس کی قسمیں اور فضائل بیان کریں۔

6۔ اولاد کے حقوق و فرائض قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کریں۔

7۔ اسلام نے عورت کو معاشرہ میں کیا مقام دیا ہے؟ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بیان کریں۔

8۔ مندرجہ ذیل کے حقوق و فرائض پر مختصر نوٹ لکھیں۔
رشتہ دار، ہمسائے، اساتذہ، غیر مسلم۔

9۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کن امور کی پابندی ضروری ہے؟

10۔ رذائلِ اخلاق سے کیا مراد ہے؟ ایسے پانچ رذائل کا ذکر کریں اور بتائیں کہ ان سے معاشرے میں کیسے بگاڑ پیدا ہوتا ہے؟